

کراچی کا مقدر جاگ اٹھا

مفتی منیب الرحمن

گلتا ہے کہ کراچی کے اچھے دن آرہے ہیں، جناب سید مصطفیٰ کمال کا ایک کمال تو جناب ڈاکٹر فاروق عبدالستار کے خطاب سے معلوم ہو گیا کہ کراچی کے دن پھر گئے ہیں، مقدر جاگ اٹھا ہے اور سڑکوں، گلیوں، سیورج لائن، واٹر لائن حتیٰ کہ درود یوار تک ہر چیز کی صفائی ہو جائے گی اور پھرے کو اس کے ٹھکانے یا ان کے بقول آخری منزل تک پہنچا دیا جائے گا اور یہ مہم سر دست غیر معینہ مدت تک جاری رہے گی۔ جناب ڈاکٹر فاروق عبدالستار اچھا شعری اور ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں اور اشعار کا برمحل استعمال بھی جانتے ہیں، لیکن انہوں نے خود دعویٰ کیا کہ وہ ذومعنی الفاظ استعمال کر رہے ہیں، گویا انہوں نے غالب کے الفاظ میں یہ نہیں کہا:

روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیہ سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالب! خدا گواہ کہتا ہوں سچ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
بلکہ یہ کہا کہ جن کے لیے کہہ رہا ہوں، وہ سمجھ جائیں گے۔ اُن سے گزارش ہے کہ ذرا نازک وقت ہے، اس طرح کے ذومعنی الفاظ استعمال نہ کریں کہ: ”کچرے کے ساتھ خرافات بھی صاف کریں گے، اپنے ٹھکانے تک پہنچائیں گے، اپنی آخری منزل تک پہنچائیں گے، وغیرہ“۔ کیونکہ دوسری طرف بھی اہل زبان ہیں اور وہ بھی اردو کے محاورات، تلمیحات اور اشارات و کنایات کو سمجھتے ہیں اور ان الفاظ کے معانی کو سمجھنے کے لیے اردو میں پی ایچ۔ ڈی ہونا بھی ضروری نہیں ہے، اہل زبان ماں کی گود میں ہی سیکھ لیتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ اگر یہ حضرات اس افتاد سے پہلے توجہ فرمالتے تو کراچی کی صفائی ہو سکتی تھی، کیونکہ متعلقہ شہری اداروں میں انہی کے عقیدت مند اور نظم کے پابند کارکنان رونق افروز ہیں۔ جناب سید مصطفیٰ کمال کا سن پیدائش 1971ء اور ڈاکٹر صغیر احمد کا 1972ء ہے اور ہم دسمبر 1964ء سے کراچی میں ہیں۔ لہذا کراچی (Karachi) ہونے میں ان سے سینئر ہیں۔ مزید اعزاز یہ ہے کہ 1965ء سے ہم نائن زیرو سے کم و بیش ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر مقیم ہیں اور نائن زیرو کے بزرگوں سے براہ راست یا فاصلاتی ملاقات اور تعارف کا شرف حاصل رہا ہے اور باہمی احترام کا رشتہ بھی قائم ہے۔

جناب سید مصطفیٰ کمال اور ڈاکٹر صغیر احمد نے فنِ خطابت کا اچھا مظاہرہ کیا ہے، اُن کی پیش کش کا انداز عمدہ ہے اور ”ذاکری“ کا ترکا لگانا بھی جانتے ہیں۔ جناب الطاف حسین نے تو اپنے لیے ایک الگ شعار خطابت ایجاد کیا ہے، کیونکہ خطابت اُن کی ضرورت بلکہ مجبوری اور روحانی غذا ہے، استاذ ابراہیم ذوق نے کہا تھا:

اے ذوق! دختر رز کونہ منہ لگا چھٹی نہیں ہے منہ سے، یہ کافر لگی ہوئی
لہذا اُن کے طویل خطابات تو اُن کے تنظیمی عقیدت مند اور نظم کے پابند جان نثار یا ”آزاد میڈیا“ کے وہ دانائے روزگار دانشور ہی سن سکتے ہیں جنہوں نے بعد میں اُس پر تبصرہ کرنا ہوتا ہے یا اُس کی تشریحات و تعبیرات بیان کرنی ہوتی ہیں یا اُس پر حسبِ توفیق تنقید کرنا ہوتی ہے۔ بہر حال اس سعادت کا حصول اپنے بس کی بات نہیں ہے، بس ٹیلی ویژن چینلوں کے ٹکریا



اخبارات کی سرخیوں سے اُن کے فرموداتِ عالیہ کے بارے میں آگہی حاصل کر لیتے ہیں۔

اسکرین پر رونق افروز ہونا کسے پسند نہیں، لیکن جناب سید مصطفیٰ کمال اور اُن کے پیروکاروں کو مشورہ ہے کہ خطابتِ نبیؐ لکھی اور مناسب وقت تک ہونی چاہیے تاکہ طلبِ باقی رہے اور سامعین کی طبیعت اُکٹانہ جائے۔ بار بار ایک ہی جیسی باتوں کی جگالی طبیعت پر گراں گزرتی ہے اور جبر کے تحت ہی سنی جاسکتی ہے۔ ایم کیو ایم میں قادر الکلام لوگ کافی ہیں، مگر ہمیں چند ہی لوگوں کا انداز پسند آتا ہے، جو سلجھے ہوئے انداز میں اور ٹھہراؤ کے ساتھ بات کرتے ہیں، جیسے فیصل سبزواری اور رضا ہارون وغیرہ۔ جناب حیدر عباس رضوی چیختے اور چلاتے ہیں، وہ یونیورسٹی کے مباحثے اور پریس کانفرنس کا فرق ملحوظ نہیں رکھ پاتے، الفاظ کا بے تحاشا اور بے محل استعمال کرتے ہیں۔ ہم دنیا کے مُدبّرین کو جب سنتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ ایک ایک لفظ ناپ تول کر اور سوچ سمجھ کر بول رہے ہیں، الفاظ کے استعمال میں نہایت کفایت شعار ہوتے ہیں، فضول خرچی نہیں کرتے، کیونکہ انہیں الفاظ کے معانی اور اُن کے معنوی اثرات اور پھیلاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں یہ شعار نہیں ہے۔

ایم کیو ایم کی قیادت نے اپنے مخالفین کو صفر اور صفروں کا مجموعہ اور ناقابلِ التفات قرار دیا ہے۔ یہ اُن کا حق ہے، مگر شاطر کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، کبھی وہ شطرنج کی بساط پر شاہ سے پیادوں کو مات دیتا ہے، جسے شاہ مات کہتے ہیں اور کبھی شاہ کو پیادوں سے گھیر کر شکست دے دیتا ہے، علامہ اقبال کے اس شعر سے ہمیں بار بار استفادہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ پیادے کی زبانِ حال سے شاہ کو ان الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں:

شاطر کی عنایت ہے، تو فرزیز، میں پیادہ فرزیز سے بھی پوشیدہ ہے، شاطر کا ارادہ صفر کی قیمت اُس کی وضع یا Positioning سے متعین ہوتی ہے۔ اگر وہ عدد کے بائیں جانب ہے تو جتنے بھی صفر لگائیں، اُن کی کوئی قدر نہیں ہے۔ لیکن اگر صفر عدد کے دائیں جانب لگتا چلا جائے تو بدترج اُس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہاں صورتِ حال کیا ہے، اگر شطرنج کی بساط کسی ماہر نے بچھائی ہے تو اس کے ذہن میں اس کا نقشہ اور انجام کیا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ: ”تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ“ یا ”ہزاروں لغزشیں حائل ہیں، لب تک جام آنے میں“، اسی کو انگریزی میں ”There are many slips between the cup and the lips“ سے تعبیر کرتے ہیں اور غالب نے کہا ہے:

دامِ ہر موج میں ہے، حلقہٴ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے، قطرے پہ گہر ہونے تک سید مصطفیٰ کمال کے کچھ سوالات وہ ہیں، جن کا ڈاکٹر فاروق عبدالستار کے پاس قابلِ قبول جواب نہیں ہے۔ 1992 کے بعد ایم کیو ایم کے دورِ ابتلا میں ڈاکٹر فاروق عبدالستار سے اُن کی خواہش پر ہماری ایک ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اُس موقع پر اُن سے عرض کی کہ ہم کراچی میں رہتے ہیں، کراچی نے ہمیں شناخت عطا کی ہے، ہم اہل کراچی کے ممنون اور شکر گزار ہیں۔ لہذا اگر کراچی کے مفاد میں کوئی بات ہو تو ہم برملا اس کی حمایت کے لیے تیار ہیں اور اس میں ہمیں کوئی ترڈ نہیں ہوگا۔ کراچی کی فلاح اور کراچی کا مفاد پورے پاکستان کا مفاد ہے۔ لیکن آپ کی تحریک کے بعد کراچی کو سب سے زیادہ نقصان تعلیم کے شعبے میں پہنچا۔ نقصان کسی بھی شعبے میں ہو، بہر حال نقصان ہے، لیکن کسی بھی قوم کا سب سے بڑا نقصان انسانی استعداد کا ہے، جسے آج کل ہیومن ریسورس کہتے ہیں اور انسانی صلاحیت و استعداد اور جوہر کا نکھار تعلیم و تربیت ہی سے ہوتا ہے، پس کراچی کا



افتخار میرٹ تھا۔ کراچی کے ہمیشہ دو ہی مطالبات تھے: میرٹ اور کوئٹہ سسٹم کا خاتمہ یعنی آزادانہ مسابقت کی فضا قائم کرنا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اہل کراچی کی نظروں سے اس وقت گرے جب جناب ممتاز علی بھٹو نے صوبہ سندھ میں ملازمتوں اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے دیہی اور شہری کی بنیاد پر بالترتیب ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد کوٹے کی پالیسی بنائی۔

کوئٹہ سسٹم کا فلسفہ یہ ہے کہ پسماندہ علاقوں میں طلبہ کو معیاری تعلیم کے وہ مواقع میسر نہیں ہوتے جو شہروں میں ہوتے ہیں، لہذا انہیں شہری معیار تک پہنچنے کی عبوری مدت میں میرٹ میں رعایت دی جائے۔ اس فلسفے کا تقاضا یہ تھا کہ جو بچے سندھ کے پسماندہ علاقوں کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں، اُن کو رعایت دی جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ اندرون سندھ کے وڈیروں اور اہل ثروت کے بچے تعلیم تو کراچی کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پاتے ہیں اور دیہی علاقے کا ڈومیسائل بنا کر پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں داخلے اور ملازمتوں کے حصول میں پسماندہ دیہی نوجوانوں کے استحقاق پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یہ استحصال کی جدید شکل ہے۔

الغرض ایم کیو ایم اپنے بنیادی مطالبات میں کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اس کے برعکس اداروں میں اپنی ذیلی تنظیموں کو غلبہ دے کر داخلوں اور ملازمتوں میں میرٹ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ رپورٹس بھی اخبارات میں آتی رہیں کہ سیکنڈری اور انٹر میڈیٹ بورڈز میں خاص لوگوں کے لیے خاص انتظامات کے تحت امتحانات منعقد ہوتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ جب ہم معیار تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اس سے پبلک سیکٹر یعنی سرکاری تعلیمی ادارے مراد ہوتے ہیں، جن میں غریب لوگوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں اعلیٰ معیاری پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم سب سے منفعت بخش صنعت اور کاروبار بن چکی ہے، تعلیم قابل فروخت جنس بن چکی ہے۔ اس لیے وہ جوہر قابل جو ملک کے گلی کوچوں، میدانوں، صحراؤں اور کہساروں میں رُل رہا ہے، اعلیٰ معیاری تعلیم اُس کی پہنچ سے بہت دور ہے، بلکہ ناقابل تصور ہے۔ وہ صرف ورکشاپس پر چھوٹے، کا کے یا بھٹے اور بھٹی کے مزدور یا زیادہ سے زیادہ قاصد یا کلرک بن کر ہی رہ سکتے ہیں۔

مصطفیٰ کمال کا دوسرا اعتراض بندے کا خدا بن جانا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک ناقابل معافی جرم ہے۔ تاریخ انسانیت بتاتی ہے کہ جو بندے خدا بن بیٹھے، خداوند لَمْ یَزَلْ نے انہیں درس عبرت بنا کے چھوڑا۔ ان کا تیسرا اعتراض کراچی کی اصطلاح میں اُن ہونا ہے۔ باقی جو چارج شیٹ یا فرد جرم انہوں نے عائد کی ہے، وہ قائد تحریک کے اپنے خطابات ہیں۔ جب انسان طاقت کی معراج پر ہوتا ہے تو اُسے اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، لیکن جب قدرت کا قانون مکافات عمل حرکت میں آتا ہے، تو یہی فرمودات قانون کی زبان میں اعتراف جرم قرار پاتے ہیں۔ سوڈا کٹر فاروق عبدالستار نے عقل مندی کی کہ اصل اعتراضات کو اپنے خطاب کا موضوع ہی نہیں بنایا، کیونکہ وہ ذہین آدمی ہیں اور انہیں سب حقائق معلوم ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تجربے کا کوئی بدل نہیں اور ڈاکٹر فاروق عبدالستار کا سیاست میں طویل تجربہ ہے۔ آپ نے تیلی اور جاٹ کا مکالمہ سنا ہوگا، تیلی نے کہا: ”جاٹ رے جاٹ، تیرے سر پہ کھات،“ جواباً جاٹ نے کہا: ”تیلی رے تیلی، تیرے سر پہ کواہو۔“ جاٹ سے پوچھا گیا کہ وزن تو بنائیں، اُس نے کہا: ”وزن بنے یا نہ بنے، سر تو پھوٹ جائے گا۔“ سو سر پھوٹنے سے غرض ہونی چاہیے، وزن سے کیا لینا دینا۔